پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین
پرنسپل، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج کوٹ سلطان، لیہ
ڈاکٹر عنایت حسین لغاری
شعبہ سندھی، وفاقی جامعہ اردو، کراچی

سرائیکی تنقید.... ایک تحقیقی و تنقیدی جائزہ
SERAIKI CRITICISM AN INVESTIGATIVE AND CRITICAL STUDY

Abstract

Criticism is an important domain of literature and it is aptly stated that the creation of first rate literature is almost a dream in the absence of sound criticism. Seraiki poetry and folk literature are important constituents of Pakistani poetry and literature. Yet it is no less than a tragedy that standard criticism is not being written down in Seraiki which has given rise to the threat of the extinction of effective literature in Seraiki. This article comprises of an investigative and critical study of criticism and Seraiki criticism bringing forth the idea to produce criticism with reference to Seraiki dialect and stylistics in the light of the living landscape of Seraiki literature and culture.

شعر وادب کی دنیا سے اگر ''تنقید'' کو منہا کر دیا جائے تو شعری اور ادبی تفہیم کے دروازے بند ہو جائیں گے کیونکہ تفہیماتِ ادب اور تحقیق و تجزیہ کے لیے تنقید بنیادی حوالہ ہے۔ لیکن اسے صرف ادب کا حوالہ سمجھنا بھی صحیح نہیں۔ تنقید کی اپنی اہمیت ہے اور یہ اپنے طور پر خود ادب بھی ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں ادبیات کے میدان میں تنقید ایک بڑے ڈسپلن کے طور پر متعارف ہوئی ہے۔ تنقید، جستجو اور کاوش سے عبارت ہے۔ جس کی تحریک انسان کے فطری ذوقِ جستجو، تجسس اور نئی باتوں کی دریافت، حصولِ علم اور اپنے تجربات کو بیان کرنے کے جذبے سے ہوتی ہے۔ اس فکر اور قول کے پیش نظر مغربی نقاد آرنلڈ تنقید کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''دنیا میں اچھی سے اچھی باتیں سوچی اور معلوم کی گئی ہوں اور پھر ان کی جستجو اور کھوج کی ایک والہانہ خواہش کا عنوان ''تنقید'' ہے۔ چاہے اس کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے کیوں نہ ہو۔''[۱]

اس لیے آسکر وائلڈ نے کہا تھا کہ:

''جس دور میں اچھی تنقید موجود نہ ہو اس عہد میں اچھا ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔''[۲]

اور پروفیسر آل محمد سرور نے اس بات کی مزید وضاحت اس طرح بیان کر دی کہ :

''اچھی تنقید محض معلومات ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ وہ سب کام کرتی ہے جو ایک مؤرخ، ماہر نفسیات، ایک شاعر اور ایک پیغمبر کرتا ہے۔ تنقید ذہن میں روشنی کرتی ہے اور یہ روشنی اتنی ضروری ہے کہ بعض اوقات اس کی عدم موجودگی میں تخلیقی جوہر میں کسی شے کی کمی محسوس ہوتی ہے۔''[۳]

اس بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تنقید ادب عالیہ کی تخلیق میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن پاکستان کی علاقائی زبانوں میں بڑی تنقید کا فقدان ہے۔ جس سے یہ خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ یہاں عظیم شعر و ادب کا سلسلہ کہیں منقطع نہ ہو جائے۔

اس سوال کا جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ انھی علاقائی زبانوں (پنجابی، سندھی، سرائیکی، بلوچی اور پشتو) میں وارث شاہ، سچل سرمست، خواجہ غلام فرید، مست توکلی اور خوشحال خان خٹک جیسے عظیم شاعر بھی تو پیدا ہوئے اور اس وقت تنقید اور تنقیدی افکار کا کسی بھی سطح پر چرچا نہ تھا۔ لیکن ایک بات ضرور تھی کہ ان زبانوں کی مالک قومیں تہذیبی اعتبار سے کامل اور پختہ تھیں اور وہ صدیوں سے اپنی الگ اور منفرد شناخت کے ساتھ زندہ تھیں۔[۴]

اس لیے ایلیٹ کے نزدیک :

''کلاسیک اس وقت وجود میں آتا ہے جب کوئی تہذیب کامل یا پختہ ہو چکی ہوتی ہے، اس کا ادب اور زبان کامل ہو چکی ہوتی ہے۔ کلاسیک حد درجہ مہذب اور ترقی یافتہ دماغ کا کارنامہ بھی تو ہوتا ہے جو اپنی تہذیب و زبان کی سب خوبیوں کو جامعیت کی صورت دے کر ان کو آفاقی درجہ دلا دیتا ہے۔ دماغ کی پختگی، زبان کی پختگی اور اسلوب کی آفاقی جامعیت ایک کلاسیک کے اوصاف ہیں۔''[۵]

اس تناظر میں وادی سندھ میں بسنے والی قومیں مکمل، سچی اور زندہ تہذیب کی رکھوالی تھیں۔ اس لیے یہاں خواجہ فرید جیسے شعراء نے لاجواب شاعری کی اور اپنا لینڈ سکیپ اسی دھرتی کو بنایا۔

خواجہ غلام فرید کو جو زبان ورثے میں ملی اس کے بارے میں یہ حقیقت مان لی گئی ہے کہ یہ زبان اسی دھرتی کی زبان ہے اور یہاں کے قدیم قبائل ''منڈا'' اور '' دراوڑ'' اس کے مالک اور محافظ تھے۔ اسلم رسول پوری اس زبان کے بارے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

''سرائیکی علاقہ اور سندھ میں کیہل، بھیل اور اوڈوں کی قدیم موجودگی بھی غیر آریائی آوازیں، لغت اور پیچیدہ قسم کی صوتی نحوی تبدیلیوں کی اس جدید نظریے کی حمایت کرتے ہیں کہ سرائیکی زبان یہاں کے قدیم مقامی باشندوں کی زبان ہے اور اس کی موجودہ صورت قریباً ایک ہزار سال پہلے وجود میں آچکی تھی۔ مسلمانوں کی ملی اور مذہبی زبانیں ہونے کے باوصف عربی اور فارسی نے اسے موجودہ شکل دینے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔''[۶]

لیکن اس زبان میں تخلیق ہونے والے شعر وادب کے اساسی موضوعات تصوف اور مذہب تھے۔ اس کی مثالیں ہم نور نامے، معراج نامے، مولود، لغت، پکی روٹی، اہل بیت سے جڑے مرثیے، اولیاء کرام سے وابستہ عقیدتیں اور قرآنی قصص کی بنیاد پر قصے کہانیاں اور لوک داستانوں میں لاتعداد روحانی حوالے سرائیکی شاعری کی شناخت ہیں۔ کالونیل اور پوسٹ کالونیل عہد میں مزاحمت اور موجودہ عہد میں جاگیر دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ رویے کے خلاف آوازیں اور دھرتی کے پس منظر میں اپنی قومی، لسانی شناخت اور محرومیوں کے اظہار کے نئے شعری اسالیب بھی سامنے آئے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سرائیکی زبان جو اپنے عقب میں طویل تاریخ اور بڑی تہذیب رکھتی ہے وہاں اس کے شعر وادب کی پرکھ کے لیے تنقیدی، افکار اور اسالیب نہ ہونے کے برابر ہیں اور میں اسلم رسول پوری کی اس بات کے ساتھ مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں، یہ بات انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں یوں کہی ہے:

''موجودہ سرائیکی ادبی تنقید زیادہ تر عملی ادبی تنقید ہے۔ نظری تنقید کا نسبتاً فقدان ہے۔ اس کے علاوہ یہ تنقید تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتی ہے اور یہ ماضی یا آج کے مختلف ادبی نظریات سے نابلد ہے اور کہیں بھی ان کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ اس لیے یہ زیادہ تر ایک ادھوری تنقید ہے جو قاری کو سوچنے اور سمجھنے کے عمل کو تحریک نہیں دیتی اور یہ عملی تنقید زیادہ تر شائع ہونے والی سرائیکی کتب کے جائزوں یا تبصروں پر مبنی ہوتی ہے یا پھر کسی لکھاری کے کام کا جائزہ۔ سرائیکی میں نظری تنقید پر کام کا رجحان بہت کم ہے۔ بعض تخلیقی لکھاری ابھی تک اردو سے اپنا دامن ہی نہیں چھڑا سکے اور وہ سرائیکی ادبی تنقید بھی اردو زبان میں لکھتے ہیں۔ ۷

یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح اردو کا نقاد آج تک اپنا دامن مغربی تنقید سے نہیں چھڑا سکا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کہ عالمی شعریات اور ادبیات کو جو فنی اور فکری توانائی ملی وہ اہل مغرب ہی سے ملی۔ ارسطو کی بوطیقا کے بعد ہوریس کے کچھ تنقیدی اصول، ان کے بعد رومیوں نے انتقاد کے فن میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ وسطی دور میں تنقید کے کئی شہ سوار سامنے آئے اور تنقید کے نئے مباحث کا آغاز ہوا۔ ان ناقدین میں لان جائی نس، کروچے، ولیم ورڈزورتھ، ایلیٹ، آرنلڈ، ڈرائیڈن، والٹر پیٹر، آئی اے رچرڈز، جانسن، شیلے، ساں بوا، سڈنی اور کولرج کے تنقیدی افکار آج بھی تروتازہ ہیں۔ ۸

لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہم اپنے فن کو ہر صورت انھی تنقیدی تصورات سے پرکھنے کی ضد کریں۔ ہمارے ہاں تنقید کا مشرقی تناظر بھی موجود ہے جو فارسی سے اردو میں منتقل ہوا، فارسی زبان کے ساتھ ساتھ عباسی عہد میں عربوں نے بھی تنقیدی افکار متعین کرنے میں زبردست کاوشیں کی تھیں جو آج زبانِ اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ فارسی سے اردو میں آنے والی تنقیدی کتب: حدائق البلاغت، چہار مقالہ، عروض سیفی، اعجاز خسروی اور معیار الاشعار وغیرہ ہیں۔ ۹ ان کتب میں کہیں کہیں تنقیدی اصول

مطالعہ کیے جا سکتے ہیں۔ سرائیکی زبان میں آج تک شعر وادب کے اصولوں پر کوئی مبسوط کتاب نہیں لکھی گئی، جس کی وجہ سے تخلیق کار کی ذہنی تشکیل میں رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ تخلیق اور تنقید کے مابین ایک بڑا رابطہ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ یہ دونوں (تخلیق اور تنقید) ایک دوسرے کے لیے مشعل راہ ہوتی ہیں۔ اس بحث میں پڑے بغیر کہ ان دونوں میں کسے اولیت ہے اگر ہم ادب کی تاریخ کا جائزہ لیں تو پتا چلے گا کہ یہ دونوں صلاحیتیں ایک دوسرے کے فروغ کے لیے مدد ومعاون ہوتی ہیں۔

تنقیدی اصول ہمیشہ فنی تخلیقات کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں اور عظیم فن پاروں سے اخذ کیے جاتے ہیں۔ مگر ایک بار جب یہ اصول وضع کر لیے جاتے ہیں تو آئندہ فنی تخلیق کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کی بڑی مثال ارسطو کی معروف کتاب ''بوطیقا'' ہے جس میں فن کے جو اصول پیش کیے گئے تھے، وہ انھوں نے یونان کے بڑے ڈرامہ نگاروں کو سامنے رکھ کر وضع کیے تھے۔ لیکن ارسطو کی ''بوطیقا'' صدیوں تک تخلیق فن کے لیے مشعل راہ بنی رہی اور آج بھی سند کے طور پر مانی جاتی ہے۔

بعض دفعہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ انگلستان میں سڈنی کی تنقید کے اخلاقی اور اصلاحی پہلو سے متاثر ہو کر دورِ ایلزبیتھ کے مشہور شاعر سپنسر نے اپنی کتاب، فیری کوئین لکھی۔ اسی تناظر میں اردو ادب کی مثال دیکھ لیں تو محمد حسین آزاد کے لیکچر اور الطاف حسین حالی کا مقدمہ شعر وشاعری، اردو شاعری کی ایک انقلابی رو کی بنیاد ٹھہرے اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو شاعری کی دنیا میں فکری اور اسلوبیاتی سطح پر ایک انقلاب آگیا اور ان کے (آزاد، حالی) تنقیدی تصورات کے ذریعے اردو شاعری میں موضوع، فن اور تیکنیک کی نئی راہیں متعین ہو گئیں اور اس طرح اردو زبان میں نئے افکار اور نئے اسالیب متعارف ہوئے اور انھوں نے آنے والی پوری اردو شاعری کا مزاج بدل کر رکھ دیا۔[1]

ایلیٹ کا اہم خیال یہ ہے کہ ہر نسل اپنی تنقید کا نظام خود پیدا کرتی ہے۔ ہر نسل کا تہذیبی مزاج الگ ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے ورثے میں علمی وادبی روایت کے ساتھ تاریخی شعور بھی لے کر آتی ہے اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ روایت، جذبات واحساسات کے اظہار کے اس تسلسل کا نام ہے جو ہر عہد کی سماجی، تہذیبی اور شعری تبدیلیوں سے متاثر ہو کر بھی اصل سے جدا نہیں ہوتی۔ جدید سرائیکی شاعری کا بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ اس کا اپنے کلاسک سے رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ اردو کی مغلوبیت نے اسے ''کافی'' کے باطنی احساس سے بالکل الگ کر دیا ہے۔

سرائیکی شاعری کے گزشتہ تناظر میں گیت، ماہیا، ٹپا، سمی، دوہڑا اور کافی اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ موجود ہیں مگر آج کے سرائیکی شاعر نے نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم، غزل، ہائیکو کے تتبع میں سرائیکی شعری روایت کو بالکل نئے آہنگ سے قبول کر کے اپنی شعری روایت سے منہ موڑ لیا ہے۔ اب اس کی علامتیں، استعارے، تلازمے، کنائے، اشارے اور تشبیہیں سرائیکی لینڈ سکیپ کی بجائے کہیں

اور سے کشید ہونے لگی ہیں، یہی حال سرائیکی نثر بالخصوص ''سرائیکی تنقید'' کا ہے۔ سرائیکی ادب کا بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں تنقید کا نام و نشان تک نہیں۔ ہم عزیز شاہد، اشو لعل اور رفعت عباس کو کب تک سرسری تجزیوں اور تبصروں سے پرکھتے رہیں گے۔ ان جیسے شعراء کے ذہنی ارتقاء اور ان کے استعاراتی نظام کو سمجھنے کے لیے سطحی علم ناکافی ہے۔

عزیز شاہد پورے وسیب کا شاعر ہے۔ اس کے ماحول کو سمجھے بغیر ان کی تحلیل نفسی ناممکن ہے۔ اشو لعل کو تھلوچی تہذیب اور سندھو ثقافت کے تناظر میں لے کر ہی '' ڈی کوڈ'' کیا جا سکتا ہے اور رفعت عباس کی شاعری کو چناب کی لہروں اور گرد و نواح کے فطرتی لینڈ سکیپ کی گہرائی میں جا کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم عجیب لوگ ہیں تنقیدی ادبی اور شعری مباحث کو سمجھے بغیر شاعری کیے جا رہے ہیں۔ اور جب اپنے شعراء کی شاعری کو قارئین کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے تو اردو میں ہی پڑھے گئے تبصروں اور تجزیوں کے پس منظر میں محدود مطالعے کے زور پر دو چار سطریں لکھ دیتے ہیں اور بغلیں بجاتے ہیں کہ ہم نے فلاں شاعر کا تنقیدی تجزیہ پیش کر دیا ہے۔

اردو کے مقابلے میں سرائیکی زبان و ادب کا یہ امتیاز ہے کہ اس کے عقب میں بڑی تہذیب، بڑی شعری روایت، تاریخ، اساطیر اور لوک ادب موجود ہے۔ ہمارے شعراء کی ایک بڑی کھیپ اس تناظر سے نابلد ہے۔ وہ اپنی علمی، ادبی اور شعری روایت کو اپنے اساطیر اور لوک ادب سے وابستہ کرتے ہی نہیں۔ اسی طرح سرائیکی تنقید ہے۔ ہم نے چند جملے مغربی ناقدین کے رٹے ہوئے ہیں اور انھی جملوں کے آغاز سے تنقیدی مطالعات کرتے رہتے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں شاعروں کے ہاں سرائیکی وسیب کی ریتیں، روایتیں، اساطیری حوالے اور لوک ادب سے ماخوذ شعری علامتیں دکھائی دیتی ہیں۔ انہی علامتوں کی موجودگی نے ان شعراء کو تخلیقی ادائیں بخشی ہے کیونکہ سرائیکی وسیب کا مجموعی احساس، جس میں محرومیوں کی نشاندہی بھی ہے۔ لطیف جذبات و احساسات کا اظہار بھی ہے جن میں پورا وسیب جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ اگر آج کے سرائیکی نقاد نے اپنی شاعری کو اس پس منظر میں پیش نہ کیا تو پھر آنے والی نسلیں تھل، دمان، روہی اور اپنے پورے لوک ادب اور لینڈ سکیپ سے ناآشنا رہیں گی۔[11]

گزشتہ صدی میں رومانیت، مارکسزم، وجودیت اور دیگر علوم فنون اور کسی حد تک سائنس کی متنوع تھیوریز نے عالمی ادبیات کو متاثر کیا اور شعری اور نثری اسالیب نئے سرے سے متعین ہوئے اور آج کی بحث میں ساختیات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے مباحث نے عظیم فنکاروں کو ''ڈی کوڈ'' کیا ہے۔ اگرچہ سرائیکی زبان جو اس وقت عظیم شاعری قارئین کو دے رہی ہے اس کی تفہیم کے لیے مذکورہ مباحث سے استفادہ نہیں کیا جا رہا۔ عالمی سطح پر ''مین سٹریم'' میں شامل ہونے کے لیے ''مقامیت''

سے بہت آگے جا کر خود کو منوانے کا عمل تو ابھی شروع ہی نہیں ہوا تو پھر بڑی تخلیق کی حوصلہ افزائی کس طرح ہو گی؟

شاید یہ المیہ پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں کا مقدر بن کر رہ گیا ہے۔ ہماری جامعات جہاں ایم۔ اے، ایم۔ فل، اور پی۔ ایچ ڈی کی سطح کی تحقیق ہو رہی ہے وہاں بھی چور دروازوں سے ''کاغذ کے پرزے'' جن پر ڈگری کا عنوان درج ہوتا ہے، برابر تقسیم ہو رہے ہیں۔ شخصیات پر مقالے لکھوانے کی بجائے علمی اور فلسفیانہ موضوعات پر کام ہونا چاہیے۔ مثلاً ڈاکٹر اشو لعل کی شاعری کا ساختیاتی مطالعہ یا لسانیاتی اور نفسیاتی مطالعہ وغیرہ۔ اسی طرح سرائیکی کے لوک ادب کا جدیدیت کے تناظر میں تحقیق اور تنقید یا سرائیکی شاعری کا اساطیری مطالعہ وغیرہ۔

بلاشبہ زبان و ادب کا ارتقاء ریاستی سرپرستی کے بغیر سست روی کا شکار ہو جاتا ہے اور ہمارے ہاں یہ خلا موجود ہے لیکن ریاست سرائیکی شعبہ جات کے کام میں رکاوٹ تو نہیں اور نہ ہی انفرادی سطح پر کسی طاقت نے ہمارا ہاتھ روک رکھا ہے کہ ہم ادبی مطالعات کو مختلف افکار اور نظریات کی روشنی میں آگے نہ بڑھائیں؟ تخلیق کے لیے وجدانی ذوق ناگزیر ہے مگر تنقید کے لیے ذوق کے ساتھ گہرے مطالعے، تاریخی شعور اور اپنی علمی ادبی اور شعری روایت سے آشنائی بھی لازم ہے، نہیں تو ہم سطحی اور سستے مذاق سے عبارت تبصرے اور تجزیے ہی پڑھتے رہیں گے اور اپنی شاعری کو کوئی بڑی اور ٹھوس علمی بنیاد فراہم نہیں کر سکیں گے۔

سرائیکی زبان میں اب تک صرف ایک تنقیدی دبستان متعارف ہوا ہے اور یہ دبستان بھی کسی مربوط صورت میں موجود نہیں کیونکہ دبستان کا یہ صرف ''واہ'' کا پہلو ہے۔ یہ تاثراتی تنقید کا سب سے کمزور پہلو ہے جس کی بدولت ناپختہ شاعر بھی خود کو خواجہ فرید سمجھنے لگے ہیں۔

اس لیے سرائیکی لکھاریوں کو اپنے تخلیقی ورثے کی حفاظت کے لیے معاصر عالمی تنقید سے روشنی لینا پڑے گی اور پھر اس عالمی تنقید کو وسیبی علمی، شعری اور ادبی حوالوں سے منسلک کر کے سرائیکی شعر و ادب کو ''ڈی کوڈ'' کر کے بڑی تخلیقات کے لیے نئی راہیں متعین ہونے کے اسباب پیدا کرنے ہوں گے۔ اب سرائیکی ادب کے نقاد کو اپنے اندر اعتماد پیدا کرنا پڑے گا اور ''اردو زدہ'' نثر یا تنقید کی بجائے سرائیکی لہجے اور اسالیب میں بڑی تنقید لکھنی ہو گی، نہیں تو ہمارے ہاں بڑی تخلیق کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ اورنگ زیب نیازی، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو تنقید، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵، ص، ۴
۲۔ بحوالہ، علی محمد خان، ڈاکٹر، اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اصناف نظم ونثر، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۱۴، ص ۳۰۶
۳۔ ایضاً، ص ۳۰۶
۴۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، نثریات، لیہ: آرٹ لینڈ، ۲۰۱۵، ص ۷۶
۵۔ اسلم رسول پوری، سرائیکی ادب وچ معنی دا پندھ، رسول پور: سرائیکی پبلی کیشنز، ۲۰۱۴، ص ۱۱۱
۶۔ اسلم رسول پوری کا انٹرویو مشمولہ، پیلوں، مدیر انوار احمد، ملتان، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۵، ص ۳۳۱
۷۔ بحوالہ، علی محمد خان، ڈاکٹر، اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اصناف نظم ونثر، ص ۳۰۷
۸۔ ایضاً ص ۳۰۷
۹۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، مغرب کے تنقیدی اصول، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء، ص ۷، ۶
۱۰۔ مزمل حسین ڈاکٹر، نثریات، ص ۹۷
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۱۵